اُردو ادب اور سیاست

ڈاکٹر شائستہ حمید خان
اسسٹنٹ پروفیسر اُردو
جی سی یونیورسٹی، لاہور

URDU LITERATURE AND POLITICS

Shaista Hameed Khan, PhD
Assistant Professor of Urdu
GC University, Lahore

Abstract

There has been a strong bond between literature and politics ever since. National politics directly impacts our literature. Literature offers its services for reform and betterment of the society. Traces of an individual, state and politics are found in every epoch of literature. Whether it is a fiction or novel or poetry, every writer has dealt it extremely well. The similarity between literature and politics is also found in the fact that both are directly concerned with the society. Therefore, the relationship between literature and politics is very deep and constant. This article deals with the relationship between Urdu literature and politics.

Keywords:
اردو، ادب، سیاست، احمد علی، سید سجاد ظہیر، رشید جہاں، انگارے، برصغیر، لاہور

ادب اور سیاست دونوں ہی بہت وسیع موضوع ہیں ۔ادب میں ایک اہم بحث ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی رہی ہے ۔ہندوستان اور اُردو ادب کی اہم تحریک، ترقی پسند تحریک ہے جس کا باقاعدہ آغاز ۱۹۳۶ء میں ہوا گرافسانوں کی کتاب ''انگارے'' (مطبوعہ:۱۹۳۲ء) کی اشاعت کو اس کا نقطۂ آغاز فرض کیا جا سکتا ہے ۔اس تحریک کی بدولت ادب برائے زندگی کو فروغ ملا ۔اُردو زبان کے آغاز وارتقا کے حوالے سے ڈاکٹر ساجد امجد کا کہنا ہے:

''برصغیر میں وہ تہذیبی عمل جو مسلمانوں کے دم سے شروع ہوا تین سطحوں پر مشتمل ہے ۔یعنی تجارت، حکمرانی اور صوفیا کرام کی تبلیغی سرگرمیاں ۔تجارت نے محض ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کیا، حکمرانوں نے سرکاری سطح پر ہندو مسلم ملاپ کا انتظام کیا اور صوفیا نے عوامی حلقوں میں گھل مل کر اُن کے ذہنوں کو متاثر کرنے کا مبارک فریضہ انجام دیا ۔ان تینوں سطحوں کے مجموعے نے ایک تمدن تخلیق کیا ۔اسی تمدن نے جب لفظی شکل اختیار کی تو اُردو زبان وجود میں آئی ۔''(۱)

اُردو زبان کا آغاز وارتقا ہی لشکری صورت میں ہوا ۔اس میں کئی زبانیں کئی تہذیبیں اور ثقافتیں موجود ہیں جنھوں نے ایک نئی معاشرت کو جنم دیا جو آج اُردو زبان کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے ۔کسی بھی معاشرے کا اہم عنصر سیاست ہے ۔ادب اور سیاست میں اہم مماثلت اس لیے بھی ہے کہ دونوں کا تعلق براہ راست فرد سے ہوتا ہے ۔معاشرے میں رہنے والے ہر فرد کی ضرورت معاشرے کا ماحول، اس کے انتظامی اور اخلاقی امور سب سیاست سے تعلق رکھتے ہیں ۔سیاست معاشرے کے لیے کی جاتی ہے اور ادب بھی اسی معاشرے کے لیے لکھا جاتا ہے ۔انیس باقر اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''ادب اور سیاست کا چولی دامن کا ساتھ ہے کیونکہ ہر دور کا ادب اُس عہد کا آئینہ دار ہوتا ہے ۔انقلاب روس کے چند بڑے قلم کاروں میں گورکی، نکولائی، استروسکی، چیخوف اور پھر ادیبوں کی ایک نسل پیدا ہوئی ۔''(۲)

ادب جہاں انقلاب کا باعث بنا وہاں ادب اور سیاست کا تعلق بھی ہمیشہ سے گہرا رہا ہے ۔اُردو ادب اور سیاست کے تعلق کو دیکھنے کے لیے سب سے پہلے ہمیں ترقی پسند تحریک نظر آتی ہے ۔ترقی پسند تحریک سے پہلے بھی ہمارے پاس ایسا ادب موجود تھا جس کا تعلق براہِ راست سیاست سے تھا اور وہ ہمیں معاشرتی، تہذیبی، فکری، معاشی اور سیاسی اقدار سے واقف کرواتا ہے ۔ترقی پسند تحریک کے حوالے سے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''رومانیت اور حقیقت نگاری کی تحریکیں ایک طویل عرصے تک الگ الگ جہت میں سفر طے کرتی رہیں ۔ترقی پسند تحریک کی ابتدا ہوئی تو یہ دونوں دھارے آپس میں مل گئے ۔چنانچہ ترقی پسند تحریک نے اقبال کی رومانیت سے تخلیقی قوت اور جوش کی رومانیت سے بغاوت کا جذبہ حاصل کیا ۔''(۳)

''انگارے'' کے مصنفین میں احمد علی، سیّد سجاد ظہیر، رشید جہاں اور محمود الظفر شامل تھے۔ یہ کتاب ایک بغاوت کے طور پر سامنے آئی جس میں زندگی کی بے کیفی، یک رنگی اور دقیانوسی خیالات کے خلاف غصے کا اظہار ملتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کا مقصد ادب برائے زندگی تھا۔ یہ ادب زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے تھا اور اس کا ہدف معاشرے کو اُس کی حقیقی اہمیت سے آگاہ کرنا تھا۔ نیز ترقی پسند تحریک کا مقصد آزادیِ مساوات، انسان دوستی، مظلوم اور نچلے طبقے کے لوگوں کو بلند سطح پر لانا تھا۔ اس تحریک سے وابستہ اہم شاعروں میں علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، فیض احمد فیض، جاں نثار اختر اور اسرار الحق مجاز شامل تھے۔ فیض کی ترقی پسند تحریک کی نمائندہ نظم کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہن گر کی دُکاں میں
تند ہیں شعلے سرخ ہے آہن
کھلنے لگے قُفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول کہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

حبیب جالب کی ملکی سیاست پر مبنی ایک نظم ملاحظہ ہو:

دیپ جس کا محلات میں ہی جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے
ایسے دستور کو، صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا

اسرارالحق مجاز اپنی شاعری میں سیاسی حالات بیان کرتے ہوئے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے کہ سخت طوفانی اندھیری رات کے بعد ایک سحر بھی ہے۔خواب سحر کی تعبیر سے پر امید انداز کا نمونہ دیکھیں:

ذہن انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں
زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں
کچھ نہیں تو کم سے کم خواب سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک ادھر دیکھا تو ہے

اسی طرح ساحرلدھیانوی کہتے ہیں:

نہ منہ چھپا کے جیے ہم نہ سر جھکا کے جیے
ستم گروں کی نظر سے نظر ملا کے جیے
اب ایک رات اگر کم جیے تو حیرت کیوں
کہ جب تلک بھی جیے مشعلیں جلا کے جیے

ترقی پسند تحریک میں کچھ بے باک اور نڈر شاعر وادیب بھی شامل تھے۔ترقی پسند شاعروں پر یہ الزام لگایا جاتا رہا کہ اُنھوں نے ہنگامی موضوعات پر شاعری کی اور سیاسی تقریروں کو شاعری کے لبادے میں ڈھال کر شاعری کا نام دیا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ترقی پسند شعرا نے اپنے معاشرے کے ہر دُکھ اور ہر شکوے کو اپنی تخلیق کے ذریعے احتجاج کی آواز بنایا۔یہ شاعری عیش ونشاط کی شاعری نہیں بلکہ معاشرے کے تلخ حقائق کو سامنے لانے کی شاعری ہے۔یہ شاعری کسان کے ہاتھوں میں لگی مٹی اور مزدور کے پسینے کی شاعری تھی،جس کی وجہ سے اس تحریک کی سخت مخالفت بھی کی گئی۔ان شاعروں اور ادیبوں میں محمد حسن عسکری،ن م راشد،میراجی،ممتاز مفتی اور سعادت حسن منٹو شامل ہیں۔یہ وہ تخلیق کار ہیں جنھوں نے ادب کے ذریعے معاشرے کی بہت خدمت کی ہے۔اپنے ادب سے معاشرے کو تلخ حقیقتوں سے آگاہ کیا ہے۔ملکی سیاست،معیشت،معاشرت اور تہذیب وثقافت سے ہر فرد کو آشنا کرنے کی کوشش کی ہے۔المیات پر روئے ہیں۔نعرہ بازی اور چیخ وپکار بھی کی ہے۔سعادت حسن منٹو کے افسانے جنھیں فحاشی تصور کیا گیا وہ کمزور طبقے کو بیان کرتے ہیں۔جنسی ہوس،غریبی اور عام محلوں میں رہنے والے لوگوں کی زندگیوں کو بیان کیا ہے۔منٹو پر تنقید کرنے والوں کو اُنھوں نے خود ہی جواب دیا کہ اگر اُن کے افسانے ناقابل برداشت ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ یہ معاشرہ ہی ناقابل برداشت ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''آزادی پر ترقی پسند ادبا کا ایمان کمزور پڑ گیا اور اُنھوں نے برملا کہنا شروع کر دیا:یہ آزادی نہیں یہ پاکستان اور ہندوستان کے سرمایہ دار اور جاگیرانہ طبقے کو آزادی ملی ہے عوام کو لوٹنے

کی۔تقسیم سے پہلے اور بعد کے سماجی حالات میں کوئی بنیادی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔آج ہمارے ملک پر نیم سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام رائج ہے۔"(۴)

ان تمام باتوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ادب پر سیاست مسلسل اثر انداز ہو رہی تھی اور ادبا کے افکار اس بات کی گواہی ہیں کہ سیاست ادب کا ایک اہم موضوع بن چکی تھی۔

اُردو افسانے کا بھی ایک اہم موضوع سیاست اور اس کے اثرات رہے ہیں۔چاہے وہ افسانوی ادب آزادی سے پہلے کے حالات بیان کر رہا ہو یا پھر آزادی کے بعد بننے والے پاکستان کی بدحالی کے تذکرے کر رہا ہو۔اس دور میں لکھے جانے والے تمام افسانے سیاسی سرگرمیوں اور سیاست کے پیدا کردہ ماحول کا احوال بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں۔منشایاد کا افسانہ 'کہانی کی رات' یا رشید امجد کا "گھوڑا گھر میں تازہ ہوا کی خواہش" ہمیں سیاسی پس منظر دکھاتے ہیں اور سیاست کی وجہ سے تشکیل پذیر حالات کا بیان پیش کرتے ہیں۔انور زاہدی کا افسانہ "دوسرے سیزر کی موت" بار بار حکومت کے رد و بدل کی طرف اشارہ کرتا دکھائی دیتا ہے جو ایک سیاسی سرگرمی ہے۔انیس ناگی کا افسانہ "سایہ" بھی سیاسی موضوع پر مبنی ہے جو سیاسی حوالے سے ہونے والی کرپشن کے بارے میں ہے۔اس کے علاوہ "مجسمہ ساز" طارق محمود کا، اشفاق احمد کا "چھ چھیکا بیں"، مسعود اشعر کا "خاموشی"، انور سجاد کا "ماں اور بیٹا"، رشید امجد کا "بے پانی کی بارش"، احمد جاوید کا 'حسن تو سہی' اور احمد داؤد کا "جواں مرگ کا نوحہ" یہ وہ افسانے ہیں جن میں ہمیں بار بار حکومتوں کی تبدیلی نظر آتی ہے۔یعنی یہ تمام افسانے آزادی کے بعد پاکستان کے سیاسی استحکام پر طنز کی صورت میں پیش ہوئے ہیں۔سیاست کا دوسرا اہم موضوع احساسِ تحفظ ہے جو ظاہر ہے کہ عوام سے متعلق ہے۔بقول ڈاکٹر راحیلہ بشیر:

"اکثر افسانہ نگاروں کے ہاں پاکستان کو ایک عمارت یا ایک قلعہ سے تشبیہ دی گئی ہے لیکن کسی نہ کسی وجہ سے اس میں بسنے والے عجیب و غریب قسم کے خوف میں مبتلا ہیں۔عدم تحفظ کا احساس نفسیات، مذہب اور فلسفہ کی نظر میں شر ہے۔"(۵)

اس ضمن میں چند اہم افسانے اور بھی ہیں جن میں منشایاد کا "رُکی ہوئی آوازیں"، انور زاہدی کا "عذاب شہر پناہ" اور اے خیام کا "چیستان۲" شامل ہیں۔ڈاکٹر راحیلہ بشیر مزید لکھتی ہیں:

"افلاطون نے اپنی کتاب جمہوریہ (Republic) میں مثالی ریاست کے قیام کے حوالے سے جو نظریات پیش کیے اُن کو پیش نظر رکھیں تو افواج کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب ریاست کے لوگوں کا واسطہ دوسری ریاست سے پڑتا ہے۔محافظ کا کام ہے ریاست کے حق میں اپنے فرائض سرانجام دیں۔اسلام اور دیگر مذاہب تحفظ اور امن و امان کی تلقین کرتے ہیں۔یہ موضوع مختلف افسانہ نگاروں کے ہاں منفرد انداز میں ملتا ہے۔"(۶)

سیاست چونکہ طاقت کا دوسرا نام ہے اس لیے حکمرانوں کے ہاتھوں میں قوم کا تحفظ ہوتا ہے۔ حکمرانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی ریاست میں اپنے عوام کی حفاظت کریں۔ پاکستان میں اس سیاسی ذمہ داری کے حالات کیسے رہے ہیں یہ مسئلہ بہت سے اہم افسانہ نگاروں کے ہاں ملتا ہے۔ مثلاً انور زاہدی کا افسانہ ''اُدھڑی ہوئی سڑک''، اسد محمد خان کا ''وارث''، احمد جاوید کا ''غیر علامتی کہانی'' امراؤ طارق کا ''کرفیو کی ایک رات''، غلام عباس کا ''دھنک''، خالدہ حسین کا ''مکڑی'' اور مظہر الاسلام کا ''کندھے پر کبوتر'' وغیرہ۔ اسی طرح آزادیِ رائے اور دیگر موضوعات پر لکھے جانے والے افسانوں میں خدیجہ مستور کا ''محافظ ملک''، رشید امجد کا ''تماشہ عکس تماشہ''، جاوید اختر بھٹی کا ''مگر تم زندہ رہنا''، زاہدہ حنا کا ''جسم و زبان کی موت سے پہلے''، انور سجاد کا ''سیاہ رات''، سلیم اختر کا ''عذاب میں گرفتار بستی'' اور مرزا حامد بیگ کے افسانے ''رہائی'' سے پتہ چلتا ہے کہ اُردو افسانوی ادب میں ان ادبا نے ملکی حالات اور سیاست کو اپنے افسانوں کا موضوع بنا کر ادب اور سیاست کے تعلق کو سچ اور درست ثابت کیا ہے۔

اُردو ناول نگاری میں کثیر تعداد میں ایسے ناول موجود ہیں جو سیاسی، معاشرتی اور معاشی حالات کی عکاسی کرتے ہیں مگر ان میں زیادہ تر وہ ناول ہیں جو آزادی اور آزادی کے حالات و واقعات کو بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ اس خطے کا سب سے اہم سیاسی، تہذیبی اور مذہبی واقعہ تقسیم ہند ہی تھا۔ اس ضمن میں ہمیں مختلف قسم کے ناول ملتے ہیں جن میں کچھ تصورِ آزادی کو بیان کرتے ہیں جیسے ''ابن الوقت''، ''فسانۂ آزاد''، ''امراؤ جان ادا'' اسی طرح پریم چند کے ناولوں میں سماجی زندگی اور قومی آزادی کے جذبات نظر آتے ہیں۔ جنگ عظیم دوئم کے بعد عزیز احمد کے ناولوں میں اُس وقت کی صورتحال پائی جاتی ہے اور جنگ اور جنگ کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ کرشن چندر نے ''شکست'' لکھ کر سوشلسٹ پروپیگنڈے کا اظہار کیا تھا۔ کرشن چندر کی تحریروں میں فطرت پسندی کا عنصر موجود ہے لیکن اُن میں شدت نہیں ہے۔ کرشن چندر انسان دوستی کے قائل تھے۔ سیاست اور نظریے سے اُن کی محبت سماجی حقیقت کی بنا پر قابل قبول تھی۔ ''شکست'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''شام آہستہ آہستہ درانتی چلانے لگا۔ اسے معلوم ہوا کہ وہ ایک نئی زبان، ایک نئے ادب، ایک نئی تہذیب، ایک نئی زندگی سے آشنا ہو رہا تھا۔ اس کے اپنے اصول تھے۔ آہستہ آہستہ درانتی چل رہی تھی۔ الف بے تے، الف بے تے۔ درانتی کسان کا قلم تھا۔''(۷)

قرۃ العین حیدر کو اُردو ادب کی عظیم ناول نگار مانا جاتا ہے۔ اُنھوں نے امیر طبقے کے بارے میں زیادہ لکھا ہے اور اُن کے طرزِ معاشرت کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ اُن کے ہاں اہم چیز اجتماعی لاشعور نظر آتا ہے۔ وہ شاید اس لیے کہ اُنھوں نے مغربی ادب بھی پڑھ رکھا تھا اور مغربی علوم سے بخوبی واقف تھیں۔ مگر اس کے باوجود اُن کی تحریریں مغربی علوم سے زیادہ متاثر نظر نہیں آتیں۔ ''میرے بھی صنم خانے'' میں اُنھوں نے جاگیردارانہ

گھرانوں کے جدید طرزِ عمل کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ ''آگ کا دریا'' بھی اسی صورتحال کا عکاس ہے۔ ''میرے بھی صنم خانے'' میں ایک جگہ لکھتی ہیں:

''جہاں سبھی کا ایک دوسرے سے صدیوں کا بھائی چارہ اور میل ملاپ تھا۔ سبھی ایک دوسرے کو کسی نہ کسی رشتے داری کے نام سے پکارتے آئے تھے۔ سبھی ایک دوسرے کے دُکھ درد کے شریک تھے۔ آج دس بلم برداروں کی محافظت میں وہ اس قصبے میں داخل ہوئے تھے۔''(۸)

سیاست انسانی زندگی کا ایک لازمی جز ہے۔ اس کی اہمیت اُردو فکشن میں پہلی جنگِ عظیم کے بعد اور بھی زیادہ ہوگئی تھی جب حالات نے ایک نیا رُخ لیا اور انسانی تباہی کے وہ مناظر منظرِ عام پر آئے جسے دیکھ کر رُوح بھی کانپ جاتی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ممتاز احمد خان لکھتے ہیں:

''دوسری جنگِ عظیم میں جان و مال کی وہ تباہی دیکھنے میں آئی کہ سابقہ ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ یورپ میں ذہنی و فکری کجی کے حامل افراد نے پوچھنا شروع کر دیا کہ (نعوذ باللہ) کیا خدا ہے؟ پھر ناول نگاروں کا ایک طبقہ پیدا ہوا جس نے سیاست کو بھی تاریخی و معاشرتی صورتِ حال کے ساتھ جوڑ کر دکھایا۔ برصغیر میں آزادی کی تڑپ نے جو سیاسی صورتحال پیدا کی اور سیاسی جماعتوں نے جس طرح اس عظیم مقصد کے لیے جدوجہد کو مظاہرہ کیا وہ ناول کا بھی حصہ بنا۔''(۹)

حیات اللہ انصاری کا ناول ''لہو کے پھول'' ۱۹۱۱ء کے بعد سے شروع ہو کر آزادی کے مرحلے سے گزرتا ہوا آزادی کے بعد کے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور معاشرتی حالات کی منظر کشی پر ختم ہوتا ہے۔ اس ناول میں کئی طبقاتِ انسانی کو دکھایا گیا ہے۔ امر سنگھ جیسا مخلص کسان اور اس کا خاندان جاگیردار، راجے، عام لوگ، عالم دین، مولوی، چالاک لوگ، طوائفیں، پڑھے لکھے اور ان پڑھ لوگ، امیر و غریب طبقہ، سادہ دل اور ریاکار لوگ ہر نوع انسانی کی تصویر اس ناول میں دکھائی گئی ہے۔ اس کے علاوہ فرقہ وارانہ فسادات، مختلف تحریکیں، کمیونسٹوں، کانگرسیوں، مسلم لیگیوں اور سماجی بہبود کے اداروں کی تحریکوں کا بیان بھی تفصیلاً کیا گیا ہے۔ یہ ناول پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس ناول کے متعلق ڈاکٹر محمد عارف لکھتے ہیں:

''زمانی اعتبار سے اس کا پھیلاؤ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۵۰ء تک ہے۔ یہ زمانہ ہندوستانی تاریخ کے اہم مراحل پر مشتمل ہے۔ تقسیم بنگال کے خلاف کانگرسی تحریک، تنسیخ تقسیم بنگال، دہلی دربار، کلکتہ سے دارالسلطنت کی دہلی منتقلی، تحریک عدم تعاون، تحریک خلافت، نمک سازی، ڈانڈی مارچ، سائمن کمیشن، دہشت گردی کی وارداتیں، بھگت سنگھ اور اُس کے ساتھیوں کی شہادت، دو عظیم جنگیں، انتخاباتِ کانگرسی وزارتیں، قراردادِ لاہور، ہندوستان چھوڑو تحریک، آزادی، قیام پاکستان، فرقہ وارانہ فسادات اور ہجرتیں: یہ ناول تاریخ کے ان تمام اہم سنگ ہائے میل کا احاطہ کرتا ہے۔''(۱۰)

جیلانی بانو کا ''ایوانِ غزل'' بھی حیدرآباد کی بکھرتی ہوئی تہذیب کو بیان کرتا ہے۔ یہ جاگیردارانہ نظام کے زوال پر ایک بحث کے طور پر سامنے آیا ہے۔ اس میں اُنھوں نے آزادی کے اثرات واضح کیے ہیں کہ کیسے آزادی کے نعروں سے ایک تہذیب بکھر رہی ہے مگر اندورنی حالات وہی ہیں۔ راما نند کا ناول ''اور انسان مر گیا'' میں فرقہ وارانہ فسادات کی طرف نشاندہی کی گئی ہے۔ انسانوں کی درندگی، غارت گری اور بے حسی ناول کا بنیادی موضوع ہے۔ یہ ایسے منظر کی عکاسی کرتا ہے جہاں لوگ اپنوں کو ہی مار رہے ہیں۔ اپنی عورتوں کو اپنے ہاتھوں قتل کیا جا رہا ہے تا کہ دشمنوں کے ہاتھ نہ لگیں۔ انسان کی درندگی کی انتہا اس ناول میں دکھائی گئی ہے۔ لہٰذا یہ فسادات پر ایک اہم ناول ہے۔

خدیجہ مستور کے ''آنگن'' میں ہندوستانی سیاست کی دو مضبوط ترین جماعتوں کو دو گھرانوں کے سربراہان کی زندگیوں کے قصے کے ساتھ بہت غیر جانبدارانہ طریقے سے برتا گیا ہے۔ ''آنگن'' میں تاریخ اور سیاست ایک دوسرے میں جذب ہو کر زبردست فنی اور فکری تاثرات کو اُبھارتا ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''جب 'آنگن' مجھے پڑھنے کو دی گئی تو میں نے یہی دیکھنے کے لیے اسے پڑھا اور شروع ہی سے مجھے محسوس ہو گیا کہ اس میں ایک گھرانے کے جو واقعات بیان ہونا شروع ہوئے ہیں ان میں دلچسپی کے علاوہ ایک فلسفیانہ اور اشاراتی تاثر بھی موجود ہے۔''(۱۱)

اسی طرح آزادی کے بعد ہجرت کے موضوع پر کئی اہم ناول منظر عام پر آئے جن میں آغا بابر کا ''حوا کی بیٹی''، ہرچرن چاولہ کا ''بھٹکے ہوئے لوگ''، ڈاکٹر خالد سہیل کا ''ٹوٹا ہوا آدمی''، فخر زمان کا ''بے وطن''، عصمت چغتائی کا ''ایک قطرہ خون''، نثار عزیز بٹ کا ''نگری نگری پھرا مسافر''، خدیجہ مستور کا ''آنگن''، ممتاز مفتی کا ''علی پور کا ایلی'' اور قدرت اللہ کا ''یا خدا'' قابل ذکر ہیں۔

اُردو شاعری میں بھی سیاست کو موضوع بنایا گیا ہے جس میں معاشرے اور سیاست کے باہمی تعلق سے آگاہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان شعرا کرام میں جوش ملیح آبادی کی نظمیں ''غلاموں کی بغاوت''، ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام''، ''نظام نو'' اور ''انسانیت کا کورس'' قابل ذکر ہیں۔ دوسرے اہم شاعر فیض احمد فیض ہیں۔ علی سردار جعفری کی شاعری میں بھی کچھ ایسے موضوعات ملتے ہیں جن میں سیاسی رنگ غالب ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

کوئی اب اُڑتے شرارے کو دبا سکتا نہیں
کوئی بادل سُرخ تارے کو چھپا سکتا نہیں
جاگ اُٹھے کوہ و صحرا، ناچ اُٹھے آبشار
ہو گئے بیدار شام و نجد و ایران و تتار

ایک ہی ہلکے سے جھٹکے سے کلائی موڑ دے
اے مجاہد سامراجی اُنگلیوں کو توڑ دے

کیفی اعظمی، جاں نثار اختر اور ساحر لدھیانوی ایسے شعرا ہیں جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے اپنے خیالات ونظریات کی تبلیغ کی ہے۔ جاں نثار اختر کا ایک شعر ملاحظہ کریں:

میں اُن اجداد کا بیٹا ہوں جنھوں نے پیہم
اجنبی قوم کے سائے کی حمایت کی ہے

ساحر لدھیانوی لکھتے ہیں:

غدر کی ساعتِ ناپاک سے لے کر اب تک
ہر کڑے وقت میں سرکار کی خدمت کی ہے

حاصل بحث یہ کہ ادب اور سیاست کا ہر دور میں بہت اہم ساتھ رہا ہے۔ ملکی سیاست ہمارے ادب پر براہِ راست ہمیشہ اثر انداز ہوتی رہی ہے۔ ادب نے معاشرے کی اصلاح وبہتری کے لیے ہر طور سے خدمات انجام دی ہیں اور ادب برائے زندگی سے زندگیوں کو روشنی بخشی ہے۔ فرد، ریاست، ادب اور سیاست کا ساتھ ہر دور کے ادب میں مل جاتا ہے، چاہے افسانہ نگاری ہو ناول نگاری یا پھر شاعری۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) ساجدامجد،ڈاکٹر،اُردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات،لاہور:گنج شکر پریس،۲۰۰۳ء،ص:۹۱

(۲) انیس باقر، ادب اور سیاست،ایکسپریس نیوز،لاہور،۵ اپریل ۲۰۱۳ء

(۳) انورسدید،ڈاکٹر،اُردو ادب کی تحریکیں،کراچی:انجمن ترقی اُردوپاکستان،۲۰۱۳ء،ص:۴۳۴

(۴) ایضاً،ص:۴۵۴

(۵) راحیلہ بشیر،ڈاکٹر،اُردو افسانے میں خیر و شر کا تصور (قیام پاکستان کے بعد)،فیصل آباد:مثال پبلشرز،۲۰۱۵ء،ص:۲۳۲

(۶) ایضاً،ص:۲۳۶

(۷) کرشن چندر،شکست،لاہور:آئینہ ادب،س ن،ص:۹۳

(۸) قراۃالعین حیدر، میرے بھی صنم خانے،لاہور:مکتبہ میری لائبریری،۱۹۶۵ء،ص:۳۸۹

(۹) ممتازاحمدخان،ڈاکٹر،آزادی کے بعد اُردو ناول،کراچی:انجمن ترقی اُردوپاکستان،۲۰۰۸ء،ص:۲۵۴

(۱۰) محمد عارف،ڈاکٹر، اُردو ناول اور آزادی کے تصورات ،لاہور:پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۰۶ء،ص:۵۶۲،۵۶۳

(۱۱) احسن فاروقی،ڈاکٹر،ادب میں فلسفہ،مشمولہ:سیپ،شمارہ نمبر۲،س ن،ص:۲۴